دامن دل کو بچائیں کیا۔

اس وقت میں پوسٹ مین تھا: جب میں نے اس لڑکی کو پہلی بار دیکھا تھا۔ میری یادداشت میں آج بھی وہ سیاہ گیٹ محفوظ ہے جس کے سامنے جب میں اپنی سائیکل روک کر گھنٹی بجاتا تو وہ بھاگتی ہوئی آتی تھی۔ اور اس کی جلد بازی کا اندازہ مجھے اس بات سے ہوا کہ بعض اوقات وہ دوپٹے کی جگہ کوئی تولیہ یا غلاف وغیرہ قسم کی کوئی چیز شانے پر پھیلائے ہوئے تھی۔ ایک مخصوص ایرو گرام جو دوسری ڈاک کے علاوہ ہوتا تھا۔ شاید کسی یورپی ملک کا ہوتا تھا۔ نام مجھے یاد نہیں آرہا۔ بہرحال کبھی یہ ایرو گرام رجسٹر ہوتا تھا۔ کبھی عام ڈاک سے۔ مگر وہ پاگلوں کی طرح دوڑ کر آتی اس نے کبھی میری طرف نہیں دیکھا تھا۔..... ایرو گرام اور دوسری ڈاک لے کر وہ ایرو گرام کو بے صبری سے چیرتی پھر تی واپس ہو جاتی۔ وہ اس قدر دل کش و سادہ تھی کہ میں، جس کا واسطہ تقریباً" ہر روز ڈاک کی منتظر حسینہ سے پڑ جاتا۔ اسے دیکھتا رہ جاتا۔ دیکھنے کا انداز ہوتا تھا۔ یہ خود اس پری پیکر کی اداؤں پر منحصر تھا۔ اگر وہ ایرو گرام لے کر بالکل ہی بے خبر ہو جاتی تو میں پوری آنکھیں پھاڑ کر دیکھتا ہوا سائیکل آگے بڑھا دیتا تھا۔ اور اگر کبھی وہ حاضر دماغی سے ڈاک وصول کرتی تو چور نگاہوں سے تکنے ہی پر اکتفا کر لیا کرتے تھا۔ یہ اور بات تھی کہ اس کا پروقار مغرور سا انداز و بے نیازی جو کسی کمتر کے لیے کسی برتر کا عطیہ ہوتی ہے اور اس کے عالی شان گھر کی امارت مجھے دوبارہ اپنے جاے میں ڈال دیتی تھی۔

کبھی اس سیاہ گیٹ والے گھر کی ڈاک نہ ہوتی تھی تب میں شرارت سے رک کر گھنٹی بجا دیا کرتا تھا۔ اور اسے دوڑتا دیکھ کر بظاہر بے نیاز بنا سائیکل چلاتا گزر جاتا۔

اور پھر وہ لڑکی مجھے اچھی طرح زبانی یاد ہو گئی۔ میں نے اپنی اس ملازمت کے دوران بڑے بڑے ڈاک کے منتظر بے صبرے دیکھتے تھے۔ مگر وہ ایک ہی یکتا و لاثانی نکلی۔

ایک روز وہ کالج یونیفارم میں ملبوس کتابیں اٹھائے شاید کالج سے واپس آ رہی تھی میں اس کے گھر سے کافی دور ایک گھر کے سامنے کھڑا پارسل کے سلسلے میں دستخط لے رہا تھا کہ وہ چلی آئی۔

(میں اس کی کھنک دار آواز کو کیسے بھلا دوں)

"سنو پوسٹ مین' حماد منزل کی ڈاک ہے؟"۔

گویا اس بے صبری کے لیے پانچ منٹ بھی زیادہ تھے۔ وہ یہیں سے ڈاک لے جانا چاہتی تھی۔ مگر افسوس! اس روز حماد کی ڈاک نہ تھی۔ ایک تو وہ لڑکی اس قدر لاپرواہ اور پر اعتماد تھی کہ اسے اس بات کی ذرا بھی پرواہ نہیں تھی کہ کوئی اس کی حرکتوں سے خط اٹھا رہا ہے یا مسکرا رہا ہے۔

"نہیں" میں نے افسوس سے سر ہلا دیا۔

اپنی مترنم آواز سے وہ بہت زیادہ مہذب و پڑھی لکھی لگتی تھی۔ خاص طور پر اس کا "سنو پوسٹ مین" کہنا مغرورانہ انداز کے باوجود بہت پیارا و منفرد لگتا تھا۔

اور پھر میری ڈیوٹی دوسرے ایریا میں لگ گئی۔ میری جگہ اس ایریا کے لیے دوسرا پوسٹ مین آگیا مگر مجھے وہ اپنے نام کے ساتھ یاد رہی' جانے کیوں۔ حالانکہ اس کی بے تابی' بے صبری اور انتظار نے مجھے بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ ایرو گرام اسی کے نام پر ہوتا تھا۔ باقی ڈاک زیادہ تر حماد احمد بیرسٹر کے نام ہوتی تھی۔ ایرو گرام پر اس کا نام بڑے خوب صورت انداز میں لکھا ہوتا لکھنے والے باوالی کی انگریزی کی لکھائی حد درجہ خوب صورت تھی۔ اس پر وگرام کی وصولی رسید پر اسکے ہی دستخط ہوتے تھے۔ بہرحال وہ کافی عرصہ یاد رہی اپنی "سنو پوسٹ مین" کی بازگشت کے ہمراہ۔

پوسٹ آفس کی ملازمت سے گزارہ مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہو رہا تھا۔ تب اپنے ایک جگری یار کے کہنے پر ڈرائیونگ سیکھ لی اور لائسنس ملتے ہی باقاعدہ ڈرائیونگ شروع کر دی۔ پہلے پہل تو پرائیوٹ بس سروے سے ملازمت شروع کی "کنٹریکٹ کیریر" میری بس کی پیشانی پر سجا ہوتا اور میں ایک مقامی کالج کے ماتھے پر میرا مطلب ہے گیٹ پر۔

ایک روز بس کے مالک کو کالج کی پرنسپل نے بلا بھیجا۔ معلوم ہوا کہ سائنس گروپ کی طالبات کے لیے کوئی پوائنٹ نہیں۔ ساڑھے تین بجے سہ پہر کے لیے بھی پوائنٹ ہونا چاہیے۔ بعض مخصوص علاقوں کی طالبات کو شام ہو جانے کی وجہ سے کافی پریشانی ہوتی ہے۔ بعض اوقات امتحانات کے نزدیک دنوں میں طالبات کافی دیر تک پریکٹیکل کرتی ہیں۔

قصہ مختصر! میری ڈیوٹی ساڑھے تین بجے والی پوائنٹ پر لگا دی گئی۔ میں یہ سن کر سخت بور ہوا تھا۔ دوپہر کو ہم سارے پوائنٹس کے ڈرائیور گپ شپ لگا کر وقت پاس کر لیتے تھے ایک تو لڑکیاں ایک ساتھ بھی تو اکٹھی باہر نہیں آتی تھیں۔ چہلیں کرتی۔ آرام سے چلتی کوٹ چادریں اتارتی۔ پہنتی باہر آتیں کہ اتنی دیر میں آدمی ایک نیند لے لے۔

میں ڈیوٹی کے پہلے روز تین بج کر بیس منٹ پر ہی کالج پہنچ گیا۔ کافی دیر سگریٹ پھونکتا رہا۔ پھر چند طالبات کو گیٹ کی سمت دیکھا۔ بس کو دیکھ کر ان میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ تھوڑا سا شور ہوا۔ شاید یہ ان کے لیے خلاف توقع بات تھی۔

آنے والی لڑکیاں خالی بس دیکھ کر کھڑکیوں کے ساتھ والی سیٹوں کی طرف دوڑیں کچھ وفاداروں نے اپنے برابر کی سیٹوں پر کتابیں رکھ کر ریزرو کیں اور لگیں پٹر پٹر باتیں کرنے۔ پوسٹ مین ہوئے' ڈرائیور ہوئے۔ ان کے سامنے کوئی رازداری نہیں برتی جاتی۔ انہیں مشینی آدمی سمجھ کر لوگ اپنی باتیں کیے جاتی ہیں۔ جیسے سامنے بیٹھا ہوا شخص آنکھ کان سے پٹ ہو اور یہ خاص طور پر کالج اسکول کی لڑکیاں تو ایک دوسری کے عشق میں بری طرح کھو جاتی ہیں۔ ذرا دیر جو زبان کو بریک لگا لیں۔ اپنے اسٹاپ پر اترتے اترتے خدا حافظ کہتے کہتے بھی جانے کتنے قصے کو تاہ کر کے سنا جاتی ہیں۔ واقعی انسان کا ہر نیا اٹھتا قدم ایک نئے تجربے کا نیا زینہ ہوتا ہے۔

بس کافی بھر چکی تھی۔ میں نے کالج پر نگاہ ڈالی۔ تب میں بری طرح چونک اٹھا۔ ایک ساتھی لڑکی کو کتابیں تھما کر وہ اپنا ہیٹی کوٹ اتار رہی تھی۔ ساتھ ہی اڑتے دوپٹے سے "پردہ داری" بھی کر رہی تھی۔ ایک تو دوپٹہ سنبھالتی عورتیں مجھے ہمیشہ پردہ داری کم اور پردہ کشائی زیادہ کرتی محسوس ہوتی ہیں۔ بہرحال اس کے دوپٹے سے نظریں ہٹا کر اس کے چہرے پر ٹکا دیں۔ وہ بس میں چڑھی سیٹ

دیکھنے کے دوران اس کی نظر مجھ پر بھی پڑی۔ مگر وہاں کوئی شناسائی کی لہر نہ تھی اس کا کھویا کھویا انداز جھکی جھکی آنکھیں دیکھ کر مجھے اس ان دیکھے شخص سے حسد محسوس ہوا جس نے اس کو ان حالت کو پہنچا دیا تھا۔ بس اپنے ہی قابل رکھ کر چھوڑا تھا سسرے نے..... کہ ادھر ادھر دیکھتی ہی نہیں۔ میں نے جھلا کر سگریٹ کا ٹوٹا باہر پھینک کر بس چلا دی۔

اس روز وہ ڈرائیونگ سیٹ کے سامنے میرے بائیں ہاتھ پر اپنی اکلوتی ساتھی کے ساتھ بیٹھی تھی۔ بعد میں دو اور لڑکیاں بھی ان کے برابر میں بیٹھ گئی تھیں۔ بس کافی خالی تھی کافی دیر انتظار کرنا تھا۔ مجھے ایک دم شرارت سوجھی۔ پرائیوٹ بس تھی ڈیک وغیرہ لگے ہوئے تھے۔ کم آباد علاقوں سے جب گزر تا تو کیسٹ لگا لیا کرتا تھا جب سے تختی شروع ہوئی تھی۔ کیسٹس وغیرہ کم ہی بج رہی تھیں۔ میں نے اس کی ایک نگاہ کی خاطر شرارت کر ڈالی۔

اے نرگس مستانہ بس اتنی شکایت ہے
سمجھا ہمیں بیگانہ بس اتنی شکایت ہے

تب اچانک شور پر کتر کتر کرتی زبانوں پر بریک لگ گئے۔ نظریں میری طرف اٹھیں ان میں وہ نظریں بھی شامل تھیں جن کی پردہ کشائی کی چاہ تھی۔ رفیع کی شرارت بھری آواز اور میری مسکراتی نظریں جو ہر لحظہ اسی طرف اٹھ رہی تھیں۔ اسے بوکھلانے کے لیے کافی تھیں۔

ہر راہ پر کترائے ہر موڑ پر گھبرائے
منہ پھیر لیا تم نے ہم جب بھی نظر آئے
ہم کو نہیں پہچانا بس اتنی شکایت ہے

تب اس کی غیر ارادی اور الجھی ہوئی نظریں دوبارہ اٹھیں۔ یہاں وہی مستقل مزاجی بھی تھی۔ یعنی میں برابر اچٹی نظر اس پر ڈال رہا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے وہ بنتی ہے۔ وہ ورنہ وہ مجھے پہچانتی ہے۔ تب حسن میری اس گستاخی پر برہم ہو گیا تھا۔ یقیناً" اس نے اور دیگر طالبات نے مجھے بازاری قسم کا عاشق مزاج نوجوان سمجھا۔ اس جرأت میں میری ازلی خود اعتمادی بھی برابر کی مجرم تھی۔ مجھے اپنی اٹھان و صورت کے متعلق کافی خوش فہمی تھی۔ ویسے در حقیقت میں اپنے بشرے

سے معقول آدمی ہی نظر آتا تھا۔ سرخ و سفید رنگت پر گھنی مونچھیں جنہیں میں تقریباً روزانہ سنوارتا تھا۔ اس وقت بھی اپنے کسرتی بدن پر سیاہ کرتا شلوار سجائے کنپٹیوں تک [illegible] مضبوط بازو اسٹیرنگ پر جمائے حسینوں کے جھرمٹ میں بڑی بہادری سے بیٹھا تھا۔ یہی بات تھی سب کہ خود پر طائرانہ نگاہ ڈالنے کے بعد مجھے خوش فہمی حقیقت سے قریب لگی۔

غربت و حالات نے آج مجھے یہاں پہنچا دیا تھا شاید میں اپنے سنجیدہ و حساس ذہن کے ساتھ یہاں نہ ہوتا کسی تعلیمی ادارے کا سنجیدہ محنتی طالب علم ہوتا۔ قدرت نے مجھے باپ کے مرنے کے بعد ہی گھر کا مقتدر اعلیٰ بنا دیا تھا۔ میری سوچیں بھٹک گئیں۔ میں نے اپنی موجودہ حیثیت کو یاد کر کے ایک آہ سرد کھینچی اور کچھ دیر پہلے کی باتیں بھلا کر ونڈ اسکرین پر نظریں جما دیں۔

اس روز وہ بس میں چڑھی تو بس کافی بھر چکی تھی۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ کے پیچھے پھنس کر کھڑی ہو گئی تب میں نے اس کے جرنلز..... اور فائل کی سمت ہاتھ بڑھا کر کہا "لائیے میں انہیں ادھر رکھ دیتا ہوں"۔

لیکن اس کے ساتھ مجھے دوسری کھڑی ہوئی لڑکیوں کی کتابیں بھی لینا پڑیں۔ ورنہ یہ انفرادیت شاید اسے مہنگی پڑتی۔ دراصل میرا انداز بھی تو اس سے اپنائیت کا جان پہچان والوں کا ہو جاتا تھا۔ فائل پر چٹ چپکی ہوئی تھی جس پر اس کا نام اور کلاس کا نام لکھا تھا وہی نام جو ایریو گرام پر ہوتا تھا۔

اور پھر میں نے آئینے میں ایک اچٹتی نظر ڈالی تھی جس میں اس کے سرخ سرخ رخساروں والا چہرہ بت بے نیاز و سادہ تھا۔ میں نے بس چلا دی تھی اس اس کی قربت مجھے پاگل کئے دے رہی تھی۔ کتنا فاصلہ تھا ہم دونوں میں 'ایک ڈرائیونگ سیٹ کی پشت کا۔

دو مرتبہ لڑکیوں نے کسی چوک پر واویلا مچا دیا تھا ایک موڑ پر زبردست جھٹکے سے وہ آگے جھک آئی۔ (اور بھی جھکی ہوں گی مگر مجھے تو اس کا دھیان تھا) اس کا دایاں ہاتھ دھپ سے میرے کندھے پر پڑا۔ ساتھ ہی اس نے جھلا کر کہا تھا۔

"کیا مصیبت ہے"

میں نے آئینے میں دیکھا۔ وہ دوپٹہ کانوں کے پیچھے اڑس رہی تھی۔ چہرہ غصے سے تپ گیا تھا۔

پیچھے سے لڑکیاں چیخی تھیں۔

"اے بھائی" اے بھیا ڈرائیور کم از کم ایک ڈگری کا گنہگار تو ہونے دو۔ تاکہ جانے والا منہ ہو جائے اللہ تعالیٰ سے یہ کہہ سکیں کچھ تو کر آئے"۔

ساری لڑکیاں اس شوخ جملے پر جو نہ جانے کس طرف سے آیا تھا کھلکھلا کر ہنس پڑی تھیں مگر اس کے تیور سیدھے نہ ہوئے تھے۔ بلاشبہ وہ کھردری اور مغرور لڑکی تھی۔ یا شاید اسے یہ احساس ہو گا کہ میں اسے آئینے میں دیکھ رہا ہوں گا۔

ایک روز شاید کوئی تقریب تھی۔ کالج میں لڑکیوں نے کہہ دیا تھا کہ کل پانچ بجے بس لے آنا۔ یہ پوائنٹ ہی دراصل اس گروپ کے لئے مخصوص تھا۔ مگر دوسری جماعتوں کی لڑکیاں بھی پوائنٹ مس ہونے کی وجہ سے اس میں بیٹھ جاتی تھیں۔ اس دن بس کا بہت برا حال ہوتا تھا۔ تب میں نے کہا تھا کہ یہ تو مالک پر منحصر ہے اگر اس نے ٹائم تبدیل کرنے کی اجازت دے دی تو لے آؤں گا۔ اور یہ اتفاق تھا کہ بس کہیں بک نہیں تھی۔ میں بس لے کر پونے پانچ بجے کالج پہنچ گیا تھا۔ پورے کالج میں رنگین آنچل لہرا رہے تھے۔ کالج بھی سجا ہوا تھا خدا معلوم کیا ہنگامہ تھا۔

پانچ کے ساڑھے پانچ پھر پونے چھ ہو گئے، مگر اب میں انتظار کرتے ہوئے گھبرا تا نہ تھا تب میں نے دیکھا وہ کلیجی سے رنگ کے شلوار قمیض میں چھوٹا سا پرس سینے سے لگائے لڑکیوں سے باتیں کرتی باہر آ رہی تھی۔ شہزادیوں کی آن بان سے۔

مرعوب ہو کر میں نے دونوں بازو اسٹیئرنگ پر جما کر سر جھکا دیا۔

کافی دیر گزر گئی۔ آج کالج کے باہر موٹر کاروں کا بھی ایک طویل سلسلہ تھا بہت ساری لڑکیاں اور ان کی استانیاں اپنی اپنی کاروں میں بیٹھ رہی تھیں۔ ان میں ایک نیلی موٹر کار میں وہ بھی بیٹھ چکی تھی۔ اس نے بھی شاید آج گھر سے گاڑی منگوائی تھی۔ اور مجھے اس کے سوا کچھ یاد نہیں کہ میں نے ایک شدید جھٹکے سے بس اسٹارٹ کی تھی۔ گاڑی کا گیر بدل کر گاڑی کو پانی کی روانی سے سڑک پر چھوڑ دیا تھا۔

اور پھر مجھ پر قیامتیں گزر گئیں۔ بس کا ایک شدید حادثہ تھا۔ میں ایک صنعتی علاقے میں دوا ساز

کمپنی کے ملازمین پہنچا کر بس واپس لا رہا تھا۔ کہ بھوسے سے بھرے ہوئے ایک ٹرک سے ایک موڑ پر میری بس ٹکرا گئی تھی۔ بس اتنا یاد ہے کہ مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ ٹرک میرے سینے پر چڑھ دوڑا ہے اس کے بعد میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا تھا۔ کچھ دنوں بعد میں ہوش میں آیا تھا میرا پورا بدن پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ ہزار شکر کہ میرے تمام اعضا سلامت تھے۔ مگر دائیں ہاتھ کی کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اس پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا ڈاکٹروں نے بتایا تھا کہ ہڈی جڑ جائے گی۔ میں نے اپنے رب کا شکر ادا کیا مجھے اپنے زندہ بچ جانے پر حیرانی تھی۔

مہینوں بعد جسم پٹیوں سے آزاد ہوا۔ مگر دایاں ہاتھ پہلے کی طرح طاقت ور نہ تھا کافی محنت لیتا تھا کام میں۔ میں ڈرائیونگ نہ کر سکتا تھا بس کی نوکری بھی ختم ہو گئی۔ گھر میں فاقے ہونے لگے تب میں بھیک کے سوا ہر کام کرنے پر تیار ہو گیا۔

آخر کار دنوں کی مار ماری کے بعد پھر قدرت نے رزق کا اہتمام کر دیا۔ میں ایک ہاسپٹل میں وارڈ بوائے کی حیثیت سے ملازم ہو گیا۔ تنخواہ اچھی نہ سہی غنیمت تھی دو بھائیوں اور ماں کے ساتھ گزارہ ہو رہا تھا۔ بھائی پڑھ رہے تھے۔ ناکاموں کو کامیابی کے لفظ سے عشق ہوتا ہے مجھے بھی تھا اور ہے اور میرے بھائی میرے وجود کا حصہ ہیں۔ ان کی خواہشات کی تکمیل کوئی احسان نہیں تھا۔

بڑے ڈاکٹر صاحب نے کافی دیر ہوئی بلایا تھا وہ بھی معمولی کی چہل قدمی کے بعد اپنے روم میں جا چکی تھی۔ اسے ہاسپٹل میں پانچواں دن تھا۔ چار روز قبل میں اسپتال کے اسی طویل برآمدے سے گزر رہا تھا کہ سامنے سے اسٹریچر آتے دیکھ کر ایک طرف کو ہو گیا تب معلوم ہوا کہ مریض نہیں مریضہ ہے اور ابارشن کا سانحہ ہے۔ روز ہی ایسے معمولات ہوتے تھے۔ یہاں تو میں تو عادی ہو چکا تھا۔ لاپروائی سے آگے بڑھ گیا تھا۔ مگر کل جب اسے ٹہلتے دیکھا تھا تو بری طرح چونک گیا تھا۔ چاند گہنا گیا تھا وہ بالکل وہی تھی میں اسے ہزاروں میں آسانی سے پہچان سکتا تھا۔

ابھی زندگی میں حادثات کی آمد و رفت تھی۔ یہ سمجھتے تو شاید سہرا بھی سج جاتا۔ تنہائیوں میں کبھی کوئی دھیان میں پڑتا تھا تو مگر یہ وہ تو ہرگز نہ تھی۔ حسین، بے نیاز، مغرور، روکھی، آہستہ آہستہ چہل قدمی کرتی نحیف و نزار کمزوری اور زردی۔

تب میں ضبط نہ کرسکا تھا۔ تیز تیز چلتا ہوا اس کے سر پر جا پہنچا۔ اس نے ایک لحہ کو سر اٹھا کر مجھے دیکھا تھا اور پھر ٹہلنے لگی تھی۔ جب میں رک کر مسلسل اسے دیکھتا رہا۔ تب وہ میری اس ناگوار حرکت پر رک کر سوالیہ انداز میں دیکھنے لگی تھی۔ وہی پر اعتماد' مغرور نگاہیں جو امیروں کا خاصہ ہوتی ہیں۔

"آپ کو مجھ سے کوئی کام ہے؟" اس نے دھیمی آواز میں مجھے مخاطب کیا تھا۔ میں بوکھلا گیا تھا۔ اب تو کچھ پھوٹنا ہی تھا۔

"وہ.....وہ جی آپ مس فوزیہ حماد ہیں جی۔ وہ دراصل" تب اس نے چونک کر میرے سراپے کا جائزہ لیا۔

"مس نہیں ہوں شادی شدہ ہوں۔ مسز فوزیہ شہرنواز۔ یہ نام جو تم ابھی لے رہے تھے یہ شادی سے پہلے میرا نام تھا اب نہیں تم مجھے کس طرح جانتے ہو۔ میں تو تمہیں نہیں جانتی تھی"

اس نے دھیمے دھیمے لہجے میں بولنے کے دوران واکنگ جاری رکھی۔ وہی مغرور اور کھردرا سا لہجہ گویا بل ابھی باقی تھے۔ نہ جانے کیوں میں اس قدر دکھی ہو گیا تھا کہ وہ مجھے نہیں جانتی۔ پورے چھ ماہ اس کے خط پہنچائے تھے۔ پورے دس ماہ بس چلائی تھی گو کہ ان باتوں کو تین سال بیت چکے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آسکا کہ میں یہ سن کر کیوں دکھی ہوا کہ وہ مجھے نہیں پہچانتی کہ ہمیں وہی یاد رہتے ہیں جنہیں ہم یاد رکھنا چاہیں یا چاہتے ہیں ورنہ ہم ملتے کس کس سے نہیں۔

اور جو نام اس نے اپنے نام کے ساتھ لگایا یعنی شہرنواز یہ اسی ایروگرام کے "سینڈر ایڈریس" کے نیچے لکھا ہوتا تھا جس کا انتظار یہ سنگ دل جادوگرنی دیوانوں کی طرح کرتی تھی یہ نام آج بھی میرے حافظے میں موجود تھا۔ اس نام کے علاوہ میں نے آج تک کسی سے حسد نہیں کیا تھا۔ مگر میں درست ہی سمجھا تھا۔

"بھئی تم نے جواب نہیں دیا کہ آخر تم مجھے کس طرح جانتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ کوئی شناسائی کی لہر کوئی پہچان کی کرن کچھ بھی تو نہ تھا۔ میں کیا بولتا وہ اب بھی بڑی تھی۔ اونچی تھی' برتر تھی ایک امیرزادی تھی۔ اور میں.....ایک حقیر سا وارڈ

بوائے۔

"وہ جی پہلے میں پوسٹ مین تھا تو آپ کے گھر خط پہنچاتا تھا۔ میرا مطلب ہے آپ کے ایریئے میں تو جی آپ کے نام سے خط ہوتے تھے۔ اور آپ ہی خط لے کر جاتی تھیں"

مجھے کچھ تو بولنا ہی تھا سو اتنا کہہ دیا۔ جس پر اس نے سر ہلا کر بے نیازی سے کہا تھا۔

"اوہ! اچھا اچھا' بھئی بڑا تیز حافظہ ہے"۔

ڈرائیونگ والا دور بتانے سے میں نے خود گریز کیا کہ "پوسٹ مین" کا ماضی ڈرائیور" کے ماضی سے زیادہ شریف تھا۔

لگتا ہے کوئی کام وام نہیں ہے تمہارے پاس بڑی غیر اہم باتیں یاد رکھتے ہو" وہ مغرورانہ لہجے میں جھاڑ کر دوبارہ ٹہلنے لگی تھی۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ شاید وہ مجھ سے پوچھے گی کہ وہ نوکری کیوں چھوڑی؟ اسپتال میں کیسے آئے؟ مگر اس نے تو اپنی عادت کے عین مطابق' مجھے نظرانداز کر دیا تھا میں کھسیا کر سر کھجاتا ہوا واپس ہولیا تھا۔

آج شام میں اس کے روم کے سامنے کھڑا سگریٹ پی رہا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اس کے ساتھ اس کی آواز آئی۔

"شہری! شہری! پلیز میری بات تو سنیں"

"سناؤ....."

"ناراض ہو کر جا رہے ہو؟"

"بہت خوش کرنے والی باتیں کرتی ہو۔ آج فرصت ملی تو آگیا۔ اب میں تمہارا ملازم تو نہیں ہوں کہ ہمہ وقت جی حضوری میں لگا رہوں پیٹ پالنا ہے۔ تمہارے والد صاحب تو دے نہیں دے گے مجھے بیٹھے بٹھائے تنخواہ"

میں یہ کب کہہ رہی ہوں۔ آخر میں آپ کی بیوی ہوں۔ اتنے بڑے دکھ سے گزر رہی ہوں مجھے آپ کے سہارے کی ضرورت ہے۔ آپ کی ذات کی۔ آواز پر آنسو غالب آ گئے تھے۔

"ان آفتوں میں تم جان بوجھ کر پھنسی ہو۔ اب بھگتو مجھے کچھ وقت کیتھنی اور بچوں کو بھی دینا

۔۔۔ نرووہ میرے بچوں کی ماں ہے" آواز رک گئی چند لمحوں بعد پھر سنائی دی۔

"تم نے مجھے کیا دیا ہے؟ ذہنی کوفت اور تین سال میں دو ابارشن"۔

"شہری! آپ پر پہلے میرا حق ہے آپ میرا نام ساتھ لے کر امریکہ گئے تھے" ہچکیاں اور سسکیاں۔

"میں کسی کی جائیداد یا زمین نہیں جس پر حق جتایا جائے میرے ذات پر میرا حق ہے۔ صرف اور اتنا حق بھی تمہیں اس وقت تک حاصل ہے جب تک میں یہ حق تمہیں دے دوں۔ جو کچھ تمہارے ساتھ ہو رہا ہے اس کی ذمہ دار تم خود ہو۔ ٹھیک ہے کہ میں نے کیتھی سے اپنی شادی بزرگوں سے چھپائی مگر تم پر تو یہ سب ظاہر کر دیا تھا اور کہا تھا کہ تم خود انکار کر دو جس پر تم نے کہا تھا کہ میں تمہیں ہر حال میں قبول ہوں۔ اب مجھ میں کیا کیڑے پڑ گئے ہیں"

بے وفائی اور ڈھٹائی کا عجیب نمونہ تھا۔

"شہری! میرے حال پر رحم کرو مجھے تمہاری محبت چاہیے۔ طعنے نہیں دیکھو کیا حال ہو گیا ہے میرا"

سسکیاں گھٹنے لگیں۔

"پوچھنے تو میں تمہارا حال ہی آتا ہوں مگر تم اس قدر شور مچانے لگتی ہو کہ میں ذہنی کوفت میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔ اپنا خیال رکھا کرو۔ اچھی طرح فرونٹنگ کرو۔ ڈاکٹر بتا رہے تھے کہ دو تین دن لگیں گے۔ ڈسچارج ہونے میں۔"

بولنے والے کا لہجہ یکلخت نرم پڑ گیا۔ چند منٹ کے بعد دروازہ کھلا بولنے والا باہر آ گیا۔ میں بوکھلا کر سگریٹ سلگانے کے بہانے ہاتھوں کی اوک پر جھک گیا۔

اب اس شک کے بوٹوں کی آواز ہلکی ہو رہی ہے۔ وہ کافی دور بڑھ گیا ہے۔ میں سر اٹھا کر اس شاندار اور خوبصورت آدمی کو دیکھ رہا ہوں۔ جو شاندار سی موٹر میں بیٹھ رہا ہے اپنی ذات کے بٹوارے کے باوجود اس کا اطمینان قابل رشک ہے۔ میرے کانوں میں ایک آواز تھی۔ گھنٹیاں بجا رہی ہے۔

"سنو پوسٹ مین' حماد منزل کی ڈاک ہے آج؟"۔